ڈاکٹر شیمل
مترجمہ: نزہت آرا

فکرِ اقبال پر مغربی اثرات

ایک صدی میں صرف چند مرتبہ یا اس سے بھی کم یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی ایسی عظیم شخصیت مشرق یا مغرب میں پیدا ہو جاتی ہے جو ان ہر دو حصۂ عالم کی ثقافتوں کی امتیازی خصوصیات کو باہم ملانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہماری اس صدی میں ایسی ہی ممتاز شخصیت اقبال کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ اس دور کے تمام مشرقی مفکرین سے بڑھ کر پاکستان کے اس روحانی خالق کی تصنیفات نے مغربی علما کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جیسا کہ آر۔ اے۔ نکلسن نے کہا ہے، اقبال کے ہاں "مشرق اور مغرب کا ملاپ ضرور ہوا ہے۔ البتہ یہ کہنا مبالغہ ہے کہ ان میں یک جہتی بھی پیدا ہوئی ہے۔"

اقبال ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور اس وقت تک اسلامی فکر کو مغربی تہذیب سے تطبیق دینے کی اولیں کوششیں کی جا چکی تھیں۔ یہ اقبال کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو مشہور مستشرق ٹامس آرنلڈ جیسا استاد مل گیا جس نے ان کو مشرقی اور مغربی افکار سے روشناس کرایا۔ یوں تو وہ پہلے ہی اردو کے شاعر کی حیثیت سے اپنی استعداد اور کمالِ فن کا مظاہرہ کر چکے تھے، تاہم آرنلڈ نے ان کو یورپ میں تعلیم مکمل کرنے کا موقع بھی بہم پہنچایا۔

اقبال کی ابتدائی غنائی شاعری میں لانگ فیلو، ایمرسن اور ٹینی سن کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے کیمبرج کے ہیگلی مفکر میک ٹیگرٹ سے تعلیم حاصل کی اور یوں وہ ہیگلی فکر کی گہرائیوں تک پہنچے جس پر اپنی عمر کے آخری دور میں انھوں نے تنقید بھی کی اور اسے بنیادی استدلال کا ثمرہ قرار دیا۔ چنانچہ "پیامِ مشرق" (۱۹۲۳ء) میں انھوں نے ہیگل کو ایسی "مرغی" قرار دیا ہے جو بغیر مرغ کے محض مستی کے زور پر انڈے دیتی ہے۔

انگلستان میں تکمیلِ تعلیم کے بعد اقبال میونخ گئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۰۸ء میں "ایران میں مابعد الطبیعیات

کا ارتقا" پر مقالہ لکھ کر ڈگری (ڈاکٹریٹ) حاصل کی۔ اقبال کی یہ تصنیف نہ صرف اہم مسلم مفکرین کے بارے میں دستِ علم کی آئینہ دار ہے جن سے کہ ابھی مغرب آشنا نہ ہوا تھا، بلکہ ٹامس اکویناس سے لے کر ہارنیک تک جدید الٰہی دینیات اور تاریخ مذاہب کے مسائل میں حیران کن بصیرت کا بھی پتہ دیتی ہے۔

اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۱۱ء میں جو روحانی تغیر اقبال میں آیا اس نے کئی ایک نکات پر ان کی رائے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ لیکن یورپی فکر کا ٹھوس علم بعد کی ہر شاعرانہ اور فلسفیانہ تصنیف میں مفید ثابت ہوا۔

اقبال حیاتیاتی فلسفہ سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ "اسرارِ خودی" ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی جس سے قدامت پسند مسلمانوں اور نقلی صوفیاء کو عظیم صدمہ پہنچا۔ اس میں اقبال نے پہلی مرتبہ اپنے ایغو یا خودی کے فلسفہ کو بیان کیا جو وحدت الوجودی تصوف کی تعلیم کے مطابق بحرِ ہستی مطلق میں فنا ہو جانے کے لیے نہیں بلکہ عشق، عمل، اور سعی پیہم کے ذریعے ترقی پانے کے لیے ہے۔

"اسرارِ خودی" کے فلسفیانہ اشعار ہوں یا اس کے بعد کی فارسی اور اردو شاعری، حتیٰ کہ شاعر کی موت کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہونے والے آخری مجموعۂ اشعار میں بھی حیاتیاتی فلسفہ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

اقبال کا آدرش ہونا (ہستی) نہیں بلکہ ہو جانا (موزونیت) ہے یعنی غیر جانبدار الوہیت نہیں بلکہ ایسا خدا ہے جو انسان کی دعاؤں کو قبول کرے۔ ایسا انسان نہیں جو اندھی تقدیر کی رسیوں میں جکڑا ہو۔ بلکہ وہ جو خدا کا شریکِ کار ہو اور اپنی قسمت کو بدلنے پر قادر ہو۔

مجھے نہیں معلوم کہ آیا اقبال نے مشہور کارتولکی مصنف فریدرش فان ہیوگل کی کسی تصنیف کا مطالعہ کیا تھا یا کہ اس سے مماثلت محض ایک اتفاقی امر ہے تاہم اس کے خیالات کے علاوہ بیکن اور لوسے کے افکار بھی "اسرارِ خودی" اور "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں پائے جاتے ہیں۔

برگساں اقبال کا محبوب فلسفی ہے اور انھوں نے بڑے کھرے اور سیدھے انداز میں برگساں کے تصورِ زماں کی دو حیثیتوں کے ذریعے قرآن کے الفاظ کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن نے جہاں ایک آیت میں یہ بتایا ہے کہ دنیا ایک لحظہ (غیر مسلسل زمانِ سماوی) میں پیدا کی گئی ہے وہاں دوسری آیت میں یہ کہا ہے کہ یہ چھ دن (مسلسل زمانِ بشری) میں وجود میں آئی ہے۔

اقبال کے ہاں زیادہ تر مشابہت نطشے سے پائی جاتی ہے جسے انھوں نے "یورپ کی دکانِ شیشہ گری میں دیوانہ" کہا ہے:

انگند در فرنگ صد آشوبِ تازۂ
دیوانۂ بکارگہِ شیشہ گر رسید

لیکن نطشے سے اس مشابہت کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ نطشے کے عیسائیت اور کلاسیکیت کے مخالف اندازِ فکر میں اس ہندی مسلمان کے لیے کافی ہمدردی اور موافقت پائی جاتی ہے جس نے خود بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں نطشے کی "بقول زرتشت" کی طرز میں "غیر معروف (یا فراموش شدہ) نبی کی کتاب" کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

اقبال اس جرمن فلسفی کے بڑے مداح ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "جاوید نامہ" میں جس آسمانی سفر کا نقشہ کھینچا ہے اس میں نطشے کو فلکِ زحل سے پرے جگہ دی ہے۔ لیکن اس کی مذہب دشمنی کی انھوں نے اتنی ہی سخت مذمت بھی کی ہے۔

اقبال کی عینیت کے لیے (ان کے اپنے تاریخ کے غائی نظریے کے خلاف) نہ تو معاودتِ ابدی کا تصور اور نہ ہی عزم برائے قوت، تسکین کا کوئی سامان پیدا کر سکے۔ اور اقبال کے دورِ آخر کے فلسفے کی رو سے عزم برائے قوت نام ہے عزم برائے عشق اور خودی کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا۔

نطشے کے UBERMENSCH (فوق البشر) کو اگر اقبال کا آدرش قرار دے بھی لیں تو مسلم فلسفی کے لیے فوق البشر کا انکارِ خدا ناقابلِ برداشت ہے۔ جس فوق البشر کا اقبال متمنی ہے وہ ہے اسلامی تصوف کا انسانِ کامل جو ایک بار رسولِ خدا محمدؐ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اس انسانِ کامل کا معراج عبدہٗ (خدا کا بندہ) ہونا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ کلی مطابقت رکھتے ہوئے عمل کرے، اور حکمِ خداوندی کو کبھی نہ بھولے۔ اقبال کہتے ہیں کہ نطشے اور انقلاب کے بعد

یعنی اہلِ روس محض "لا" (نفیِ خدا) تک محدود رہے۔ اور "اِلّا" (اقرارِ خدا) کی بلندی تک ان کی رسائی نہ ہو سکی جو کہ اسلامی کلچر کا دوسرا ستون ہے۔ نطشے پر اقبال نے کبھی "تنقید" کی ہو لیکن بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں نطشے کے بہترین ترجمان رُڈولف پانوِس نے بھی بالکل ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا ڈھانچہ ارتقائی نہیں ہے۔

اقبال پر نطشے سے زیادہ گوئٹے کا اثر ہے۔ اپنی ابتدائی عشقیہ نظموں میں اقبال نے گوئٹے کی تعریف بھی کی ہے۔ اور "پیامِ مشرق" کو مشرق کی طرف سے "دیوانِ مغرب" (WEST — OSTLICHER DIVAN) کا جواب تصور کیا گیا ہے جو موضوع کے اعتبار سے اس کے مشابہ ہے۔ اور گوئٹے کے اشعار میں (MAHOMET GESANG) (نغمۂ محمدؐ) کا آزاد ترجمہ بھی ہے۔ اقبال کے مشرقی مرشدِ روحانی مولانا روم کی طرح گوئٹے بھی:

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

فاؤسٹ، سعیِ عشق اور آرزو کا ڈرامہ ہے اور اقبال نے تمام یورپی ادب میں سے غالباً "فاؤسٹ" ہی کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے کیونکہ اسی میں ان کو اپنے عشق و ارتقا کے تصورات نظر آئے۔

اقبال کے شاہکار "جاوید نامہ" کی "تمہیدِ آسمانی" فاؤسٹ کی تمہیدِ آسمانی کے مماثل ہے۔ اپنی اس تصنیف میں جو کہ مشرقی "آسمانی طربیہ" خیال کی جاتی ہے اور جس میں دانتے کا اثر نظر آتا ہے شاعر نے زندہ رود (جیتی جاگتی ندی) کا نام اختیار کیا ہے جو کہ دراصل اشارہ ہے MAHOMET GESANG کی اس رمزیت کی طرف جس میں پیغمبرانہ روح کو جیتی جاگتی ندی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ شیطان کی شخصیت، جس کا کلامِ اقبال میں بڑا اہم حصہ ہے گوئٹے کے MEPHISTOPHELES کی غمازی کرتا ہے۔

مردود فرشتہ (شیطان) ہیں جو کہ زندگی کی قوتِ محرکہ کا دوسرا نام ہے۔ ملٹن کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے جس کی "فردوسِ گم گشتہ" کی اقبال نے بڑی تعریف کی ہے بلکہ وہ خود ایک ایسی ہی کتاب لکھ

چاہتے تھے۔ یہ تصور قرآن اور مثنوی دونوں میں ملتا ہے کہ آدم کی معصیت ہی نے اسے اس دنیا میں کام کرنے کے قابل بنایا، اور یہ کہ یہی بات اسے جنت کی معصومیت سے حقیقی زندگی اور کشمکش میں لاکر اس کے ارتقاء کا باعث بنی۔ قرآن اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ آدم خدا کا خلیفہ اور دنیا میں اس کا نائب ہے جس کے لیے عمل اس لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی ملکیت اس کی اگلی حالت میں واپس کر سکے۔ اور یہ ایک ایسا تصور ہے جسے مسلمانوں نے صدیوں کے زوال کی وجہ سے اکثر فراموش کر دیا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اس پر زور دیا ہے۔ انھوں نے مغربی فلسفے اور قرآن کی صحیح تفسیر دونوں میں دائمی عمل کے پیغام کا مطالعہ کیا اور اس کی اشاعت میں ان تھک کوشش کی۔

البتہ یہ بات حیران کن ہے کہ اقبال نے جدید سائنس کے انکشافات تک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ آئن سٹائن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جن کا نظریۂ اضافیت اور یہ تصور کہ کائنات لامحدود لیکن غیر مطلق ہے، قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔

لیکن یہ تمام مغربی اثرات ان خطرات کو اقبال کی نظر سے نہ چھپا سکے جو مغربی تہذیب کی غلامی کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات مغربی فکر اور اس سے بڑھ کر مغربی سیاست پر تنقید سے بھری پڑی ہیں۔ یہ بجا ہے کہ ان کے بعض سیاسی نظریات یک طرفہ ہیں اور ان کا تعلق ایک گذشتہ تاریخی صورت حال سے ہے۔ اقبال کی نظر میں مغرب اپنی موجودہ صورت میں عشق خداوندی سے بالکل عاری اور مجسم عقلیت ہے۔ لہٰذا خطرناک اور شیطانی ہے۔ اور مشرق عشق خداوندی سے واقف ہے لیکن ہمارے خوابوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے مغربی اثر و نفوذ کے خطرات کا علم نہیں اور یہ مغربی زندگی کے باطنی مفہوم کو سمجھے بغیر اس کی ظاہری ہیئت کی نقالی کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ جدید ترکی اور ایران کے خلاف شاعر کے جذباتی ہیجان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اقبال نے مغربی مفکرین کے افکار اور اس تعلیم کا جو انھوں نے ان کے ہاں سے حاصل کی ہے اعتراف کیا ہے لیکن مغرب کے خلاف ان کے شدید ترین حملوں کا سبب وہ بات ہے جس کا اظہار "جاوید نامہ" میں ٹالسٹائی کی روح نے کیا ہے۔ یعنی "مغرب اپنے غیر ساحرانہ طرزِ عمل اور استعماری ہتھکنڈوں کے ذریعے ہر روز روحِ مسیح کو صلیب پر چڑھاتا ہے۔"

دوسری طرف اقبال "یورپی ثقافت کی انسانی بنیادوں" سے بخوبی آشنا نہ تھے۔ افلاطون اور افلاطونیت پر ان کی "تنقید" کہیں کہیں وسعت سے خالی "ہے۔ وہ قرآن کی لازمی طور پر حرکی اور قطعی قدامت دشمن روح کے حامی ہیں۔ جو یونانی فلسفے سے بہت دور ہے۔ اس اساسی نقطۂ نظر میں اقبال کا یہی بنیادی یک طرفہ پن ہی غالباً وہ چیز ہے جس نے ان کے لیے یہ ممکن بنایا کہ وہ اسلام کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھول دیں کیونکہ مسلمان اس فلسفیانہ روح کے زیر اثر اپنی اصلی حرکی خاصیت کو بھی فراموش کر چکے تھے بلکہ قرآن کے ان الفاظ کو بھی زینتِ طاقِ نسیاں بنا چکے تھے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ — بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک
حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ — کہ وہ اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔

اقبال کو مشرق اور مغرب میں جو جو حیات آفریں قوتیں نظر آئیں ان سب سے انھوں نے اپنی قوم کی قسمت بدلنے کا کام لیا ہے۔ جیسا کہ وہ "پیامِ مشرق" میں کہتے ہیں:

چشم بکشا اے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہانِ دگر است

گرو گرنتھ صاحب اور اسلام

مصنفہ ابوالامان امرتسری

قیمت: ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ:

سیکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور